R. No. 2186/57

Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۲۰	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۲۲ رمئی ۱۹۶۸ء

اداریہ

اردو دوستوں سے خطاب

اس عنوان سے ایک کتابچہ جناب ایم۔ اے۔ حسن پھپھوندی ضلع چمپارن بہار کی طرف سے ہمیں موصول ہوا ہے اور ہم سے اس پر اظہار خیال کی خواہش کی گئی ہے۔

ایم۔ اے۔ حسن پھپھوندی کا نام ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لئے نیا نہیں۔ موصوف اردو رسم خط کی اصلاح پر برابر زور دیتے رہتے ہیں اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک کے ہماری زبان میں ان کے مضامین اور ان پر بحث لوگوں کو ابھی یاد ہوگی۔ اس رسالے میں موصوف نے تنبیہ کے طور پر اردو دوستوں کو نہایت خلوص سے کچھ عملی کام کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیں ان کے درج ذیل خیالات کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور ہم ہماری زبان کے پڑھنے والوں سے اپیل کرتے ہیں کہ ان پر غور کریں۔

اردو زبان کی ہر دلعزیزی کا ہر شخص معتقد ہے۔ اس کے الفاظ کی چاشنی سب کو مرغوب ہے اور اس کے اشعار کے حسن و طرز ادا کی بھی داد دیتے ہیں۔ اردو کی تائید میں فلک شگاف نعرے لگانے والے، اس سے زبانی ہمدردی جتانے والے، اس کی حفاظت کے لئے خون بہانے اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا وعدہ کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔

لیکن اردو کی ترویج و ترقی کے لئے خون کے بدلے پسینہ بہانے والوں، زبانی ہمدردی جتانے کے بدلے کچھ ٹھوس کام کرنے والوں اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے بدلے چند پیسے خرچ کرنے والوں کی بڑی کمی ہے۔

اردو میں مختلف علوم و فنون کی معیاری کتابیں نہیں ملتیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ انگریزی یا ہندی کتابوں کے محتاج رہتے ہیں مختلف پیشہ میں لگے لوگوں کو مطالعہ کے ذریعہ اپنے پیشے کے متعلق تازہ ترین اور معیاری معلومات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا اور درسی طور پر اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں سہل الحصول نہیں سمجھی جاتی۔ اردو صحافت ہماری بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی؛ ہمیں تعداد سے آزادانہ انگریزی مجلے یا اخبار نہیں ملتے؛ کسی خاص فن پر اعلیٰ ترین معلومات حاصل کرنے کے لئے اردو رسائل نہیں چھپتے اور اردو اخبار و رسائل پڑھنے سے ہمیں سیری نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ حالات اس بات کا تقاضہ کر رہے ہیں کہ خون کے بدلے پسینہ بہا کر اردو کی تمام خامیاں دور کی جائیں اور اس کو دنیا کی ایک اچھی زبان بنایا جائے۔

اس لئے اگر واقعی ہمیں اپنی زبان محبوب ہے اور ہم اس کو پوری آن بان کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو دوسروں کا علاج چھوڑ کر صرف یہ سوچئے کہ آپ اپنے حدود کے اندر اردو کے لئے کیا کرسکتے ہیں۔ اگر آپ ادیب ہیں تو ہر فن اور ہر معیار کی اچھی کتابیں شائع کیجئے۔ اگر آپ مدرس ہیں تو طریقہ ہائے تعلیم کی ساری خوبیاں اپنا کر اردو کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں تدریسی طور پر آسان سے آسان تر بنائیے۔ اگر آپ ناشر ہیں تو تکنیکی طور پر اردو طباعت کو آسان اور سستا بنائیے۔ انگریزی معیار پر خوبصورت اخبار، رسائل اور کتابیں چھاپئے۔ اگر آپ کسان ہیں تو اپنے گاؤں کے ہر بچے کو مقامی سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھائیے۔ امداد باہمی کے اصول پر شبینہ اور صباحی مدارس کھول کر بالغ ان پڑھوں کو پڑھائیے۔ کتب خانے کھول کر اچھی کتابیں خریدیئے۔ مختلف اخبارات، رسائل اور دلچسپ کتابیں؛ نیز لوگوں میں مطالعہ کا شوق بڑھائیے اور اگر آپ کو اردو کی خدمت کرنے کا کوئی بھی موقع نہیں ہے تو کم از کم سال میں ایک دو اخبار اور چند اردو کتابیں ہی خرید کر اردو طباعت کی ہمت افزائی کیجئے۔ اگر آپ کی اقتصادی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی تو چائے پان اور سگرٹ وغیرہ جیسے غیر ضروری اخراجات کم کرکے مطالعہ کے ذریعہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرتے رہیے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اردو کا تحفظ رہے گا اور ذاتی مطالعہ

کی بہ دقت کم پڑھے لکھے بھی ادبی شہرت حاصل کر سکیں گے۔"

موصوف نے اس تمہید کے بعد اردو کی ترقی کی راہ میں کچھ بنیادی رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے اور مروجہ رسم خط کی جزئی اصلاح پر زور دیا ہے ہم تو برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ اردو کے رسم خط کو ترک کر دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس میں موجودہ دور کی تعلیمی اور طباعتی ضروریات کے تحت چند اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ پچھنبروی صاحب کی یہ تجویز نئی نہیں ہے کہ الف، بے، جیم دال کو آ، با، جا، دا، یعنی ان کی شروع کی آوازوں کے مطابق پڑھا جائے جیسا ہندی میں ہے۔ بعض دوسرے حلقوں نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ اس کے متعلق معلم اور ماہرین لسانیات ہی کوئی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ پچھنبروی صاحب نے اعراب کی تیرہ شکلوں کے استعمال پر زور دیا ہے مگر یہ بھی سوچنا ہے کہ اعراب ویسے ہی عام تحریروں میں نہیں دئے جاتے اور ان کے بڑھانے سے تحریر اور طباعت میں دشواریاں بڑھ جانے کا بھی امکان ہے۔ جہاں تک دوسری زبانوں کے الفاظ کو صحت کے ساتھ لکھنے کا سوال ہے، اس میں بھی دوسری زبان کی صحیح آواز ادا کرنا مشکل ہے اور پھر ہر زبان دوسری زبان سے الفاظ لیتی ہے تو اس میں اپنی آوازوں کے مطابق کچھ تبدیلی کر ہی لیتی ہے۔ انگریزی بھی فرانسیسی الفاظ کا تلفظ اپنے طور پر کرتی ہے۔ غیر ملفوظی حروف کو لکھنے میں استعمال نہ کرنے کا مشورہ ضرور قابل قبول ہے۔ اسی طرح کرسی کے مسئلے کو بھی حل کرنا ضروری ہے اس سلسلے میں سجاد مرزا کے بنیادی رسم خط کو اپنا لیا جائے اور محض خوش نمائی کے بجائے افادیت اور یکسانیت پر زور دیا جائے تو بہتر ہے۔ س، ص، ث کے بجائے صرف س کا استعمال اور اردو کے قاعدوں کا جدید تعلیمی اصولوں کے مطابق مرتب کرنا یہ دونوں باتیں بھی غور طلب ہیں۔ ہماری زبان کے پڑھنے والے یہ رسالہ مصنف سے طلب کر سکتے ہیں۔ اس پر بحث کے لئے ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ انجمن کی دیرینہ خواہش ہے کہ اردو دوست اس سلسلے میں کوئی عملی قدم جلد اٹھائیں۔ ہماری رسم خط کمیٹی اپنی تجاویز ہماری زبان کے ذریعے جلد اردو دوستوں کے سامنے پیش کرے گی۔

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا لکھا ہوا نایاب مسودہ

لکھنؤ ۱۱ مئی۔ کانپور میں مرزا غالب کی لائبریری سے ایک نایاب مسودہ ملا ہے اس کا نام "تقویت الایمان" ہے اس پر مرزا غالب کے دستخط ہیں اور ان کی لائبریری کی مہر ثبت ہے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ مسودہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا لکھا ہوا ہے۔ (حیات)

انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے ممبر ڈاکٹر تارا چند کو اعزاز

تہران۔ ہندوستان کے مشہور مورخ اور ادیب ڈاکٹر تارا چند کو تہران یونیورسٹی کی طرف سے اعزاز دیا گیا۔ اس سلسلہ میں فردوسی ہال میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ ڈاکٹر تارا چند کو یہ اعزاز ان کی فارسی خدمات کے صلہ میں عطا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند ایران میں ہندوستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ (الجمعیۃ)

نیشتر تبسم

رباعیات

کیا ہے ترے میخانے کی حالت ساقی
کیوں دل میں ہے رندوں کے کدورت ساقی
بہتر ہے کہ اب مے کے بجائے ان کو
دے جام میں بھر بھر کے محبت ساقی

قسمت پہ کرے ناز اگر پائے اسے
مجبور وہی ہے جو نہ ٹھکرائے اسے
پینا ہے مئے کبھی ہوتا ہے دل اے قیصر
سنبھلو کہ کہیں تمھیں نہ لگ جائے لے

ہر گھونٹ کے پینے میں نیا جوش آئے
غم آئے بھی تو حوصلہ بر دوش آئے
پینا ہے یہی کام کا پینا قیصر
بے ہوش اگر ہوں تو ہمیں ہوش آئے

سائنس کی تعلیم علاقائی زبانوں میں

کلکتہ ۱۳ مئی۔ یہاں پر مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین نے بتایا کہ سائنس کی تعلیم کا علاقائی زبانوں میں انتظام کیا جا رہا ہے انھوں نے کہا کہ سبھی ریاستوں سے کہا ہے کہ مادری زبانوں میں سائنس پڑھائی جانی چاہیے۔ (الجمعیۃ)

مولانا ابوالکلام آزادؒ ایک کتاب کی اشاعت

رام پور رضا انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے مولانا پر تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی کتاب شایع ہو گئی ہے یہ عابد رضا بیدار کی تصنیف ہے جس میں شخصیت، سوانح، تصانیف، صحافت، سیاسی افکار، دینی افکار اور نوادر کے تحت ان کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ضمیمہ الہلال، ترجمان القرآن، غبار خاطر اور مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف سے دلکش انتخابات بھی شامل اشاعت ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

۱۷ فروری ۱۹۶۹ء کو مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ برسی منانے کی سارے ملک میں زور و شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ غالب کی تاریخ وفات ہے تاریخ پیدائش نہیں۔ صد سالہ برسی کی یہ تقریب اس لئے جشن منانے کی نہیں بلکہ یہ مشرق کے اس مایہ ناز شاعر کی یاد میں ذکر و نیاز و عقیدت کی مستحق ہے۔ اس موقع پر ہمیں غالب کے نام اور کلام کی روشناسی اور اس کے فکر و فن کی پبلسٹی اور اشاعت میں عملی قدم اٹھانا ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے مختلف ادبی و ثقافتی مرکزی و ریاستی اداروں کی طرف سے تقریب صد سالہ برسی غالب کے پروگرام میں خاطر خواہ حصہ لینے کا متواتر اعلان ہو رہا ہے۔ ملک کا ہر چھوٹا بڑا ادارہ اپنی بساط کے بموجب اس تقریب کو کامیاب بنانے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ پر وقت کم ہے، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایسا وسیع اور سود مند منظم پروگرام مرتب کریں جو غالب کی شخصیت اور اس کے آرٹ کی نشان دہی میں ہر طرح مفید ثابت ہو۔ میرے ذہن میں اس طرح کے ایک ہمہ گیر پروگرام کا خاکہ ہے جسے میں غالب پرستوں کے سامنے رکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

غالب کی شخصیت بڑی رنگا رنگ اور ہر دل عزیز تھی۔ ہر شخص کو اپنے مذاق کے بموجب غالب سے کچھ نہ کچھ مقدر ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ہمارے شعری ادب میں نظیر اکبرآبادی اور نثری ادب میں پریم چند کے بعد میں سمجھتا ہوں، غالب وہ پہلے قلم کار ہیں جن کے اطوار و گفتار کے انمول خزانے سے ہر ہوش مند اور درد مند فیض حاصل کر سکتا ہے۔

غالب کی تہہ دار شخصیت کے مختلف رخ سے ارباب نقد ناشناس نہیں اور اہل نظر غالب کی باکمال قلم کاری کے معترف ہیں۔ اس وقت توجہ طلب امر عوام خصوصاً ملک کے غیر اردو داں حلقے میں اردو کے اس عظیم شاعر کو متعارف کرانے کی سعی ہے۔ اس پس منظر میں تقریب صد سالہ برسی کے پروگرام کو بحیثیت مجموعی ہمیں دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہئے۔

(الف) عوامی سطح کے تفریحی پروگرام۔

(ب) یونیورسٹی اور تعلیمی اداروں کے علمی اور ثقافتی پروگرام۔

(الف) یہ حصہ دوسرے سے زیادہ ہماری توجہ کا حاجت مند ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ غالب سے عوام کو روشناس کرایا جائے (عوام سے مراد ان پڑھ جنتا نہیں بلکہ کم خواندہ و نیم خواندہ افراد ہیں) اور ان کے دل و دماغ میں غالب کے لئے جگہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے تحت اس پروگرام کو مقبول و مفید بنانے کے لئے حسب ذیل [illegible] شامل کئے جائیں۔

(۱) غالبی قوالی — کلام غالب کی سہل و سادہ غزلوں کی قوالی جس میں پیشہ ور قوالوں کے علاوہ خوش گلو طلبہ بھی حصہ لیں۔

(۲) مقابلہ قوالی — ان غزلوں کی دو گروپ کی قوالیاں جس زمین میں غالب اور ذوق دونوں نے طبع آزمائی کی ہے۔

(۳) غالب اور ذوق کے رقم زدہ سہروں کی خوش خوانی (RECITATION)

(۴) غالبی تمثیل — غالب کے حالات زندگی کے اہم و دلکش واقعات کی تمثیل پیش کی جائے جو مندرجہ ذیل موضوعات سے متعلق ہو —

غالب کے روز و شب۔ دہلی والے اور غالب۔ انقلاب ۱۸۵۷ء اور غالب۔ غالب اور اہل فرنگ۔ غالب کے غیر مسلم مربی، دشمن اور شاگرد۔ غالب اپنے ہم عصر شعراء کی محفل میں۔

(۵) غالبی نمائش — غالب کے حالات زندگی مرقعوں اور خاکوں میں۔ غالب کی مختلف دور کی تحریریں۔ غالب کی تصنیفات و نمائش میں پیش کئے جانے والے تمام نقشے غیر اردو رسم الخط میں بھی تیار کئے جائیں۔ انجمن ترقی اردو ہند اگر اس طرح کے بڑے بڑے چارٹ طبع کرائے تو مناسب ہوگا۔

(۶) غالبی بیج اور غالبی پرچیاں — پلاسٹک یا دھات کا خوب صورت بیج اور پرچیاں تیار کرائی جائیں، جن پر ملک کی مختلف زبانوں میں غالب کا ایک شعر اور غالب کی تصویر مع تاریخ پیدائش و وفات درج ہو۔ یہ بیج اور پرچیاں عشرۂ غالب میں نہایت سستے داموں میں ہر ریاست میں فروخت کی جائیں اور یوم غالب میں ہم انہیں استعمال میں لائیں۔

(۸) غالبی طغرے — غالب کے مختصر اقوال یا غزلیہ اشعار خوب صورت پلاسٹک یا چوبی ٹکڑوں پر ڈھلے یا

کندہ کرائے جائیں جنھیں غالب پرست اپنے گھروں کی زینت بنائیں۔

(۶) فلمی شو۔ مشہور فلم ساز ڈائرکٹر سہراب مودی کی تیار کردہ فلم "مرزا غالب" کی متعدد کاپیاں تیار کرائی جائیں اور یوم غالب کے موقع پر انھیں مفت دکھایا جائے۔

(۷) مشاعرے ۔ ہفتۂ غالب یا یوم غالب کے موقع پر ہر جگہ مشاعرے ہوں۔

(ب) یونی ورسٹی اور تعلیمی اداروں کے ادبی و ثقافتی پروگرام ۔ یہ پروگرام عوامی سطح کا نہیں۔ اس پروگرام کا مقصد غالب شناسی نہیں بلکہ غالب کے فکر و فن کی غیر ملکی پیشکش اور علمی اشاعت ہے۔ اس مقصد کے تحت حسب ذیل ITEMS شامل ہوں گے۔

(۱) اسکول اور مدرسوں میں کلام غالب پر مشتمل بیت بازی کا انعامی مقابلہ۔

(۲) کالجوں میں غالب کی حیات و سیرت سے متعلق ادبی و علمی تمثیلات، جن میں ایسے موضوعات پر روشنی ڈالی جائے مثلاً: غالب اور دلی شعر، غالب اور کلکتہ، غالب کا زمانہ، ظفر استاد، صاحب العصر، غالب اور حالی، غالب کے ہم عصر معاندہ و قائد، غالب شکوں کی صف میں غالب کی تیغ زنی۔

(۳) غالب کی حیات اور شاعری سے متعلق مخصوص انعامی مذہبی مقابلے جن میں صرف طلبہ حصہ لیں۔

(۴) غالب کی حیات اور شاعری پر بہترین ادبی ڈرامے کا انعامی مقابلہ جس میں طلبہ شامل نہ ہوں۔ انعام کی رقم نہایت معقول رکھی جائے اور انعام میں صرف وہ مطبوعات دی جائیں جو "غالبیات" پر مشتمل ہیں۔ بہترین ڈرامے کو مختلف ملکی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے اور ان کی اشاعت کی جائے۔

(۵) غالب کے رنگ میں طرحی مشاعرے اور غالب کی غزلوں کی تضمین۔

(۶) مختلف ملکی زبانوں میں انتخاب کلام غالب کے ترجمہ کی اشاعت

(۷) عالمی زبانوں میں انتخاب کلام غالب کے ترجمہ کی اشاعت۔

(۸) غالب کی تمام نگارشات کے مجموعہ کی اشاعت جو کئی جلدوں پر مشتمل ہو۔

(۹) دہلی میں غالب کی آخری قیام گاہ (جہاں ان کی وفات ہوئی) کی نگہداشت و تعمیر۔

(۱۰) ہفتۂ غالب میں ریڈیائی ڈرامے اور فیچر کے پروگرام۔

(۱۱) ڈاک کے ٹکٹ پر غالب کی تصویر کی اشاعت۔

ان تفصیلات کو انجام تک پہنچانے اور انھیں مقبول بنانے میں حکومت سے زیادہ ہمیں اپنے زور بازو کو دیکھنا ہوگا۔ ان تمام ادبی اور ثقافتی تمثیلوں کی تصنیف و تالیف ہمارے کام کی ابتدائی منزل ہے۔ اس طرف ہمارے اہل قلم کو فوراً توجہ دینی چاہئے۔ بیج اپریل اور عفریب کی تیاری میں ملک کے مقتدر کاروبار پیشہ اردو دوست حضرات ہمارا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ پروگرام کے دوسرے ITEMS کے سلسلے میں ہمیں انجمن ترقی اردو ہند، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، انجمن اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، ادارہ تحقیقات ادبیہ پٹنہ جیسے مشہور اداروں کے علاوہ علی گڑھ، دہلی، عثمانیہ اور کشمیر کے جامعات سے خاطر خواہ اشتراک و تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔

کتابیں ملیں

مسیح کشمیر میں:۔

مصنف:۔ عزیز کاشمیری

ناشر:۔ روشن پبلیکیشنز۔ سری نگر

صفحات:۔ ۹۹، قیمت:۔ ایک روپیہ

نذر شعور:۔

مصنف:۔ عبدالمتین نیاز

ناشر:۔ مرکز ادب۔ بھوپال

صفحات:۔ ۱۱۲، قیمت:۔ دو روپے

تکلف برطرف:۔

مصنف:۔ مجتبیٰ حسین

ناشر:۔ حلقہ ارباب ذوق۔ حیدرآباد

صفحات:۔ ۱۶۰، قیمت:۔ تین روپے

سورج کا شہر:۔ (مجموعہ کلام)

مصنف:۔ شباب جعفری

ناشر:۔ ممتاز دارالنشر ۱۰/۸ ماڈل ٹاؤن دہلی

صفحات:۔ ۲۴۷، قیمت:۔ ۴ روپے

شاعر:۔ شمارہ ۳ و ۴ [illegible] ۱۹۶۸ء

(افسانہ و ڈرامہ نمبر)

مرتبین:۔ اعجاز صدیقی و چندر ناتھ

ناشر:۔ مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس ۲۰۲۶ بمبئی ۲

ڈاکٹر ریاض الحسن

مرزا حسین بیگ جرآر لکھنوی

(گزشتہ سے پیوستہ)

شیخ و زاہد دونوں تھک تھک کر گرے راہ ہی میں عاشقوں نے طے کیا کوچہ فنا فی اللہ کا
واقفا آشنا باللہ مجھ کو صاف صاف مرتبہ دل کا زیادہ ہے کہ بیت اللہ کا [1]

مبارک حسرت نزع جہاں اہل تنعم کو
اٹھا درویش جب دنیا سے خالی بوریا چھوڑا [2]

شکر کہ گرہ دور دہان عدم نے اک نظر دیکھا
میں پیچھے قافلے والوں کے چلایا کیا کیا [3]

ترے درویش میں ہے ساتھ استغنا کے حشمت بھی
نہیں ہیں بوریے پاؤں میں تخت سکندر پر [4]

خالص تغزل (PURE LYRICISM) اور رومانویت (ROMANTICISM) سے بھرپور اشعار بہت بلند پایہ ہیں۔ ان اشعار کی مدد سے جرآر کی غزل گوئی اور اس کی تکنیک کا صحیح اندازہ لگانا ہرگز دشوار نہیں۔ مختلف مضامین پر مشتمل یہ اشعار قابل غور ہیں ؎

پھوٹ کر ٹیلے روتے ہیں گے تلووں کے
لطف یاد آتا ہے جب بادیہ پیمائی کا [5]

دشت جنوں میں پائے برہنہ کا رنج کیا
شکوہ کب آبلوں نے کیا نوک خار سے [6]

دشت غربت میں ہوا سے جو بگولے اٹھے
تیرے عریاں نے یہ جانا کہ قبائیں آئیں
تازہ انداز دکھانے لگیں جوریں اپنا
نہ خنجر جو تری یاد ادائیں آئیں

نیند میرے مرے ساقی کو جو آئی مری یاد [7]
بارش اشک سے چھلکا دیا پیمانہ کو
یاں تو اک شکل ہے واں کچھ نہیں آنے کا نظر
شیخ مسجد نہ بنا توڑ کے بت خانہ کو

شرمگیں قتل سے عاشق کے نہ ہوئے قاتل [8]
ہے سر پہ مری آنکھوں پہ ندامت تیری

دیکھیے حسن تعلیل کی یہ مثال کتنی نازک ہے ؎

نہیں شبنم ہے یہ راتوں کو جو پھولوں پہ پڑی [9]
کس کے غم میں یہ آنسو گرے ہیں چشم انجم سے

اسی خیال کو عہد حاضر کے مشہور شاعر دل شاہ جہانپوری نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

چمن والوں نے شبنم کے پردہ رکھ لیا ورنہ [10]
پسینہ آگیا پھولوں کو فریاد عنادل سے

جرآر کے یہاں غزل کے روایتی مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں مگر ان کا مخصوص انداز بیان اور طرز فکر انھیں پامال اور فرسودہ مضامین کو ایک ندرت اور ایک تازگی بخش دیتا ہے مثلاً ؎

گئے ہم قریب حضرت زاہد ہی آ گئے [11]
کیوں معتقد ہوئے نہ کسی بادہ خوار کے
شانہ کا ہے حال پریشاں مری طرح
آفت میں پھنس گئی ترے گیسو سنوار کے

فلسفۂ گناہ اور عفو و کرم سے متعلق یہ اشعار قابل غور ہیں ؎

اطہر عزیز

غزل

یہ اتفاق تھا ہم آ گئے اجالے میں
چھپے تھے ورنہ ہزاروں ہی غار رستے میں
ذرا پکارتی رہنا مجھے بھی گردش تو
میں کھو نہ جاؤں کہیں زندگی کے میلے میں
وہی اندھیرے بنے ہیں رفیق جادۂ زیست
گلے لگے تھے کبھی جن سے ہم جو دھوکے میں
روش روش پہ جو رقصاں ہوا گل شعلوں کا
کشش کہاں سے پھر آئے وفا کے نغمے میں
جبین شب سے سیاہی سمیٹنے والو!
ہزاروں راز نہاں ہیں سحر کے سینے میں
یہ دل کی آگ ہے بھڑکی ہے اور بھڑکے گی
تلاش کر سکوں اور وہ بھی شعلے ہیں!
مجھے سکھا گئے آداب ضبط غم یارو
کہ میری عمر کٹی ہے غموں کے سائے میں
نہ کوئی سایہ، نہ آہٹ، نہ نقش پا اطہر
کسے پکارتے رہتے ہو تم اندھیرے میں

---

۱ دیوان جرآر صفحہ ۷
۲ " " " ۳
۳ " " " ۱۴
۴ " " " ۴۰
۵ " " " ۹
۶ ۹۳

۷ دیوان جرآر صفحہ ۸۱
۸ " " " ۸۰
۹ " " " ۸۹
۱۰ " " " ۸۶
۱۱ جرآر کے شعر سے یہ شعر کہیں زیادہ بلند ہے ۔ راقم
۱۲ دیوان جرآر صفحہ ۹۳

نازاں ہیں اپنے زہد و عبادت پہ اہلِ زہد
یاں آسرا ہے رحمتِ پروردگار کا

یہ نہ ہوں رند اے زاہد چشمِ سرد ہو جائے
گرے گر ایک بھی قطرہ مرے اشکِ ندامت کا

مری رندی وہ مستی بادہ نوشی خوب کام آئی
سہارا اہلِ دوزخ کو ہے میرے دامنِ تر کا

لطیف مزاح اور خندہ زیرِ لب کی مدد سے تاویلِ گناہ کا یہ انوکھا طریقہ ملاحظہ ہو ــ

گناہ کرتے نہ کس طرح بخشے جاتے ہم
سبب نجات کا پروردگار کیا کرتے
مرے گناہ جو ہوتے شمار سے باہر
تو محاسبانِ عمل پھر شمار کیا کرتے

کبھی زیادہ دل لگی کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اس طرح کے اشعار نظم ہوتے ہیں ــ

ہوا سینہ سے دل غائب ہمارا کنجِ خلوت میں
نگاہیں کس کو چوری یاں کوئی جاتا نہ آتا ہے

دل مرا واپس کرو بوسہ کا یا وعدہ کرو
فیصلہ پہلے سے ہو جائے زرِ تنخواہ کا

دل کو ملتا ہے مرے قندِ مکرر کا مزہ
کیوں نہ ہو یار کی لکنت وہ تقریر پسند

دیکھئے طنز کا لہجہ ذرا مدھم کر دینے سے یہ شعر کتنا تیر و نشتر بن گیا ہے

گھر ترا غیر سے خالی ہے نہیں آج کی رات
ہو اجازت تو میں رہ جاؤں یہیں آج کی رات

جرار کے کلام پر استاد اسیر کی زبردست چھاپ ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اسیر کی اصلاح خاص طور پر قابلِ غور ہے ــ

خفا گل سے ہوئی بلبل، اڑا دی قمری صنوبر سے
شگوفہ آپ نے گلزار میں جا کر نیا چھوڑا
ہوئے جب خاک پہنچے گرد بن کر اُن کے دامن تک
پسِ مردن نہ ہم نے شیوۂ اہلِ وفا چھوڑا

جناں میں حور نے بال اپنے سر کے کھول دیے
ترے شہید کا لاشہ جو خوں چکاں اٹھا

ظالم ذرا سمجھ کے ستانا کسی کا دل | ہر موئے تن قلم ہے رقابیِ نگار کا

صحنِ کوئے خوباں آج کس کی آمد آمد ہے | پے تعظیم سو سو بار اٹھتا ہے غبار اپنا

میری وفا سے خون بھی میرا ہے باوفا | یہ رنگ بھی چھٹے گا تری آستیں سے کب

محبت ترک کی ہم نے کہ تم نے بیوفائی کی | ہے اس کا فیصلہ اے مہرباں تمھارے ایماں پر

قتل گہ میں بیکسی یہ چھائی دونوں طرف | اس طرف حیرت میں قاتل ہے ادھر بسمل ادھر

دیکھئے آدابِ محبت اور احترامِ عشق کا یہ عالم ہے کہ ــ

زیرِ پائے ادب کے ڈھونڈے کوئی کانٹا مجنوں | کہ قدم وادیِ وحشت میں خبرداری سے

کیا ہے مزہ وادیِ وحشت میں خلش سے | تلووں سے جو اے خارِ مغیلاں مرے لگ جائے

قدم شوقِ شہادت میں نہیں بڑھتا ہے عاشق کا | قضا میں کھینچے لے جاتی ہے زمیں کوچۂ قاتل کی

لکھنؤ کی مشہور تاریخی عمارت امام باڑہ آصف الدولہ کی ہیبت ان کی نظر میں محض اس لئے نہیں ہے کہ وہ اس دور کے فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ ہے بلکہ اس کی عظمت اس لئے اور زیادہ ہے کہ اس کو دیکھ کر واقعاتِ کربلا کی یاد شاعر کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں

کربلا کی یاد میں جرار جب ہو بیقرار | دیکھئے چشمِ عقیدت سے حسین آباد کو

جرار کے کلام اور ان کے مخصوص رنگِ سخن میں قدیم و جدید کی آویزش ہے۔ مضامین وہی پٹے پٹائے افسردہ اور پامال ہیں مگر ان کے اندازِ فکر نے انہیں دوبارہ تازہ اور جوش یا افتادہ مضامین میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ اسیر کی اصلاحی نظر اور ان کی ترتیب نے زیرِ نظر دیوان کی عظمت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ دبستانِ لکھنؤ میں سلسلۂ اسیر کی ایک مضبوط کڑی (اس دور کی) اردو غزل کے لہجہ شناس اور فنِ شعر کو ایک نیا رنگ عطا کرنے والے اس شاعر کو اپنے استاد اسیر پر بجا طور پر ناز ہے۔ جرار نے یقیناً ایسے اشعار نظم کئے ہیں جن کو سن کر عرفی شیرازی جیسے بلند پایہ شاعر کی روح وجد کر سکتی ہے۔ ان کا قول ہے ــ

شعر ایسے انجمن میں پڑھے جائیں جھوم کے | عرفی کی روح وجد کرے جھوم جھوم کے

دیوان جرار صفحہ ۲
″ ″ ″ ۲۱۰
″ ″ ″ ۲۶
″ ″ ″ ۲۸
″ ″ ″ ۱۲

دیوان جرار صفحہ ۱
″ ″ ″ ۹۱
″ ″ ″ ۱۱
″ ″ ″ ۲

دیوان جرار صفحہ ۵
″ ″ ″ ۱۰
″ ″ ″ ۳۲
″ ″ ″ ۴۱
″ ″ ″ ۱۸
″ ″ ″ ۱۰۸
″ ″ ″ ۱۱۴
″ ۱۰۳
″ ″ ″ ۷۷

مراسلات

مشاعرے کے بارے میں

"ہماری زبان" میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے سردار جعفری کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے کہ شاعری سننے سنانے کی چیز ہے نیز مشاعرے اردو شاعری کا رشتہ عوام سے جوڑنے میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ گفتگو"۳" کا اداریہ بلاشبہ قابل غور ہے خلیل الرحمٰن کا اختلاف کسی حد تک درست لیکن سراسر یک طرفہ ہے۔ انھوں نے مشاعرے کے منفی پہلو پر جس زاویے سے روشنی ڈالی ہے اگر اسی زاویے سے چھپنے چھپانے کو دیکھا جائے تو یہاں بھی کچھ کم اندیشے نظر نہیں آتے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اردو شاعری کو مشاعروں سے زیادہ چھپنے چھپانے کے اس شوق بے جا سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے جسے غالب کے الفاظ میں ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی کہا جا سکتا ہے۔

مشاعروں میں بلاشبہ مختلف خیال اور مختلف ذوق کے سامعین اکٹھے ہو جاتے ہیں رسالوں کے پڑھنے والے مخصوص ذوق و رجحان کے ہو سکتے ہیں لیکن اول تو یہ کہ کسی مخصوص رجحان کے رسالے بہت قلیل تعداد میں ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ کوئی بھی رسالہ اپنے قارئین کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ چاہتا ہے اس لئے مدیر کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف ذوق کی چیزیں پیش کرے۔ لیکن ذوق میں کوئی بنیادی تبدیلی کہاں ہوتی ہے۔ وہی ذوق جو سامعین کو مشاعروں میں کھینچ لاتا ہے رسالوں کے پڑھنے پر بھی آمادہ کرتا ہے البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ مشاعروں کے تمام سامعین نہ تو اردو زبان سے یکساں واقفیت رکھتے ہیں نہ ہی وہ رسالے خرید کر پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ایسی صورت میں اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد رسالوں کے معاملے میں اور بھی قلیل ہو جاتی ہے۔ کم از کم وہ حضرات جو اردو شاعری سے دلچسپی کسی نہ کسی صورت میں ضرور رکھتے ہیں لیکن رسم الخط سے عدم واقفیت کی بنا پر اردو سے اپنی دلچسپی یکسر کھو بیٹھیں گے۔ ایسے لوگوں کی رائے ہر چند کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ان کی دلچسپی اردو زبان کے حق میں غیر مفید بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اردو شاعری کے متعلق کوئی بھی رائے مشاعرے میں پڑھی جانے والی چیزوں سے قائم ہوتی۔ نہ کہ مشاعروں کے ہنگامہ سے ہنگامے سماعت میں مانع ہو سکتے ہیں لیکن کچھ نہ سننے کے نتیجے میں کسی رائے کے قیام کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ سننے کے باوجود کوئی شخص اردو شاعری کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کرلے۔ اس کا انحصار رائے قائم کرنے والے پر ہے۔ وہ کچھ سنا تو در کنار کچھ نہ بھی پڑھے جب بھی رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس کو کسی طرح روکا نہیں جا سکتا۔

جہاں تک مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر معروف شعراء کے مجموعہ ہائے کلام کی پذیرائی خاطر خواہ نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی پذیرائی مستقبل میں ہوگی۔ رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ بھی ان کی پبلسٹی جو تبصروں کے ذریعہ کی جاتی ہے کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ وہاں بھی بسا اوقات جانبداری کو دخل ہوتا ہے اور اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ کوئی مخصوص حلقہ کسی شاعر کو یا تو بہت زیادہ اچھال دیتا ہے یا پھر اس کے خلاف صف آرائی شروع کر دیتا ہے یہاں بھی قارئین کی ذہنی تربیت خاطر خواہ نہیں ہو پاتی بلکہ مشاعروں کے سامعین کے مقابلے میں ہمارے قارئین کچھ زیادہ ہی ذہنی پراگندگی کا شکار رہتے ہیں۔ قارئین کی قوت خرید کم ہونے کے باعث غیر معروف شعراء کو اپنے مجموعہ ہائے کلام یا تو مفت تقسیم کرنے پڑتے ہیں یا پھر وہ دھرے رہ جاتے ہیں۔ مالی نقصان یہاں بھی ہوتا ہے۔ یہ نقصان صرف شعراء یا پبلشرز کا نہیں ہوتا بعض اوقات قارئین کا بھی ہوتا ہے جو کتاب کی خریداری کے بعد محسوس کیا جاتا ہے۔

مشاعروں کی جن برائیوں کی نشان دہی پر اس طرف ضرورت سے زیادہ زور صرف کیا جا رہا ہے وہ برائیاں صرف اس لئے ہیں کہ ہماری نئی نسل صحت مند قدروں کی وارث نہیں رہی اور نئی قدریں ابھی کھل کر سامنے نہیں آ سکی ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ جو ماضی کی کسی قدر پر ایمان نہیں رکھتے نئی قدروں کے تعین میں بھی خاطر خواہ حصہ نہیں لے سکیں گے۔ ان کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ وہ پرانی قدروں کی دھجیاں اڑا دیں لیکن اس عمل میں صحت مند قدروں کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ لہذا اردو زبان و ادب کے بہی خواہوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا کہ کیا مشاعرے اپنی افادیت بالکل کھو چکے ہیں اور اب صرف چھپنے چھپانے کی حد تک شاعروں کو اپنا کلام محدود رکھنا ہوگا یا ان دونوں کے صحت مند عناصر کے درمیان توازن ناگزیر ہے۔

(انیس امام)

وضاحت

میرے یکم رفروری ۱۹۷۸ء کے "ہماری زبان" میں "رفتار" کے کالم کے تحت اردو زبان کی تعلیم اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت، اردو اخبارات و رسائل، اردو پڑھنے والوں میں معیاری اور علمی کتابوں کے بجائے مبتذل

اور بازاری ناولوں کی مقبولیت اور اس قسم کے دیگر مسائل کی طرف توجہ دلائی تھی اور اس سلسلے میں کچھ تعمیری تجویزیں رکھی تھیں۔ مشاعروں کا ذکر محض ضمنی طور پر آ گیا تھا۔ مشاعروں سے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی نوعیت مشاعروں کی افادیت یا عدم افادیت کے بارے میں اصولی یا عمومی نہ تھی بلکہ ذکر آج کل کے مشاعروں کی عام فضا کا تھا جسے بدلنے کی میرے نزدیک بے حد ضرورت ہے۔ اس مضمون میں سردار جعفری کے اس اداریے کا کوئی حوالہ نہیں ہے جو انھوں نے "گفتگو" شمارہ (۳) میں لکھا ہے اور جس میں مشاعروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرے مضمون میں اس مسئلے کا ذکر ہی نہیں کہ شاعری سننے سنانے کی چیز ہے یا کتاب میں پڑھنے کی کیونکہ اس وقت تک وہ اداریہ میری نظر سے گزرا بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مراسلہ نگار نے مشاعروں سے متعلق میرے خیالات "ہماری زبان" میں نہیں پڑھے بلکہ ان کی نظر سے محض وہ اقتباسات گزرے ہیں جو "تحریک" (دہلی) نے اپنے اپریل کے شمارے میں "ہماری زبان" کے حوالے سے "مانگے کا اجالا" کے تحت شائع کئے ہیں۔ چونکہ "تحریک" کے اسی کالم میں سردار جعفری کے اداریے سے اقتباسات بھی دئے گئے ہیں جو مشاعرے سے متعلق ہیں اسی لئے مراسلہ نگار کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ میرا مضمون سردار جعفری کے جواب میں ہے یا ان کے خیالات کی تردید میں لکھا گیا ہے۔ یکم فروری کے "ہماری زبان" میں میں نے اردو زبان و ادب کے بعض اور مسائل پر بھی لکھا ہے جن میں بعض باتیں بحث طلب ہیں۔ مراسلہ نگار کا ان مسائل کے بجائے مشاعرے کے مسئلے پر اتنی تاخیر سے توجہ دینا خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ غالباً انھیں اپریل کے "تحریک" کے واسطے سے میرے معروضات کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ گذارش ہے کہ موصوف کہیں سے یکم فروری کا "ہماری زبان" حاصل کرلیں اور میرے مضمون کا مطالعہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ فرمائیں۔

اگر مراسلہ نگار یا ان کے بعض ہم خیال موجودہ دور کے مشاعروں سے مطمئن ہیں تو مجھے ان سے کچھ نہیں کہنا ہے ہاں اگر ان مشاعروں کی فضا کو بدلنے اور انھیں زیادہ موثر اور کارآمد بنانے کی ضرورت ہے تو وہ میرے پیش کردہ خیالات پر غور کریں۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

مرقع اردو اخبارات و رسائل

ہندوستانی پریس اور صحافت پر "اختر شاہنشاہی"

مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء کے بعد صرف ایک کتاب اس صدی کے اوائل میں مولوی محبوب عالم مرحوم (ایڈیٹر پیسہ اخبار) نے اردو میں شایع کی تھی اور پھر ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء میں منشی محمد دین فوق نے چند صحافیوں کا ایک مختصر سا تذکرہ بھی شایع کیا تھا یہ تینوں کتابیں اب کمیاب ہیں اور سوائے "اختر شاہنشاہی" کے ان دونوں کتابوں کا تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا۔ حال میں ہفت روزہ "دُرِّ نجف" سیالکوٹ کے پرانے فائل میں "اخباری ڈائرکٹری" (مرقع اردو اخبارات و رسائل) کا ایک اشتہار نظر سے گزرا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ (حسب بیان مشتہر) اس کتاب میں صحافت پر بہت کچھ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ یہ اشتہار اخبار "درِ نجف" سیالکوٹ کے شمارہ ۳۳ جلد ۷۔ مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۲۷ء (صفحہ ۱۲) پر بابو طفیل احمد صدیقی۔ سی۔ ڈی۔ ڈی منیجر اخباری ڈائرکٹری مقام مردان پور براہ جاپور ماڑہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اگر یہ کتاب کسی صاحب کی نظر سے گزری ہو یا وہ اس سلسلے میں کوئی معلومات مہیا کر سکتے ہوں تو صحافت کے موضوع میں ایک قابل قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

اشتہار کی نقل من و عن درج ذیل ہے۔

جس کی اخباری دنیا میں بہت عرصے سے خاص ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ چھپ کر تیار ہو گئی جس میں ہندوستان بھر کے تمام اردو اخبارات و رسائل موجودہ و "بند شدہ" اور جملہ مطابع کی مفصل کیفیت اور ان کے پتے نیز اخبارات و پریس کی ابتدا اور ان کی بسیط تاریخ اور دیسی اخبارات کا یورپ اور امریکہ کے اخبارات سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

نیز دیگر اخباری معلومات بہترین و دلچسپ پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ جدید اخبارات و رسائل کے لئے صدہا اچھے نام بھی تجویز کرکے درج کر دئے گئے ہیں۔ اور "ضابطہ شکن" ایڈیٹر صاحبان کا نقشہ سزایابی بھی شامل ہے۔ موجودہ اخبارات کے نقائص و اصلاح کی جانب خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ غرضیکہ ہندوستان بھر میں اپنے طرز اور موضوع کے اعتبار سے واحد مجموعہ ہے جناب مولانا ارشاد احمد صاحب صدیقی نے جو مسلسل ۴۴ سال سے اخباری دنیا میں کام کرنے کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہیں اور ملک بھر میں شہرت رکھتے ہیں اپنے تجربات اور معلومات کی بنا پر اس کو مرتب کیا ہے۔ یہ علمی خدمت انجام دی گئی ہے جس کی نظیر نہیں ہے جو تعلیم یافتہ ادنیٰ اعلیٰ ہر طبقہ ہر شخص کے لئے بلا تفصیل و تخصیص مذہب و ملت بیحد مفید ہے ہر سوسائٹی ہر انجمن۔ مدرسہ۔ اسکول۔ کالج۔ کلب

(باقی صفحہ ۹ پر)

امیں اوز

مکتوب لندن

یوم اقبال کی تقاریب

بریڈفورڈ میں یوم اقبال کے سلسلے میں ٹیکسٹائل ہال میں ایک عام اجتماع ہوا۔ اس مجلس کی صدارت کے فرائض چودھری فضل حق نے ادا کئے اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض عمر حیات وڑائچ نے انجام دئے۔ اس موقع پر ہمایوں مرزا صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانان برصغیر کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا سہرا علامہ مرحوم کے سر ہے۔ ہمایوں مرزا کے بعد فتوح فرازی نے علامہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پھر غلام حسین نے کلام اقبال پیش کیا اور عمر حیات وڑائچ نے اقبال کی زندگی اور سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی۔ جلسہ کا اختتام بشیر سیالکوٹی نے کلام اقبال اور محمد موسیٰ اور ساتھیوں نے مشہور نظم "شکوہ" ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔

مانچسٹر کے روبی ہال میں مورخہ ۲۸ اپریل کو یوم اقبال منایا گیا اور ابتدا ہفت روزہ "نصرت" کی تقسیم سے ہوئی۔ شہزادہ خاں صاحب نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات کی نشان دہی کی اور حاضرین کو بتایا کہ علامہ نے عمل سے پہلے فکر، عشق اور یقین کامل کی تلقین کی ہے اور عوام کو ان ملاؤں سے دور رہنے کی نصیحت کی ہے جو معاشرہ کے لیے گمراہ کن ہیں۔ نسیم احمد باجوہ نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کو ملت اسلامیہ اور نشاۃ اسلامیہ کے صف اول کا ظفی قرار دیا اور اقبال کے فلسفۂ حیات اور تعلیمات کی تشریح کی۔ اکرم چغتائی نے کلام اقبال ترنم سے پیش کیا اور سرور رجانے اپنی غزل میں علامہ کو خراج تحسین پیش کیا۔ جلسہ کی اختتامی تقریر رحمٰن صدیقی نے کی جس کا موضوع تھا "اقبال اور مغربیت"۔

برطانیہ میں اردو کتب کی اشاعت

حال ہی میں یہاں ایک اشاعتی ادارہ نے اردو کی ابتدائی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اور اب بازار میں کچھ کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ جن کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے ان میں اردو کا قاعدہ، اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کتاب قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ عوام کے لئے اردو خط و کتابت بھی شایع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اس ملک میں آئے ہوئے اردو داں بچے اپنی مادری زبان کی تعلیم بآسانی حاصل کر سکیں گے کیونکہ یہ کتابیں ہندوستان و پاکستان کی مروجہ ابتدائی کتابوں کی طرز پر تحریر کی گئی ہیں۔

صفحہ ۸ سے آگے

لائبریری، دار المطالعہ ہر پرلیس، میونسپل بورڈ آفس، اخبارات ہر کمپنی سرکاری و غیر سرکاری بجملہ دفاتر تک میں رکھا جانا نہایت ضروری ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ مع محصول ڈاک (حوالہ اخبار فرمائش میں ضروری ہے) (نادم سیتاپوری)

اردو شعرا سے گذارش

میں ایک مجموعہ کلام "نکہت کشمیر" ترتیب دے رہا ہوں۔ اردو شعرا سے گذارش ہے کہ وہ مندرجہ ذیل پتے پر منظومات ۳۰ر جون ۱۹۶۸ء تک روانہ فرمائیں۔

نظمیں کشمیر کے طبعی حسن، دلکش مناظر اور تہذیبی سرمایہ سے متعلق ہونی چاہئیں۔

سید نظر برنی ایم۔ اے
جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

گوا میں مراٹھی اور کونکنی کے علاوہ اردو کو بھی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کرانے کی تحریک

پانا جی "۵ مئی"۔ صوبائی سطح پر گوا کی زبان مراٹھی ہونی چاہئے یا کونکنی، یہ سوال کچھ عرصہ سے گوا کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے پریشانی کا موجب بنا ہوا ہے۔

یہ اختلافی مسئلہ اس وقت زیادہ شدت اختیار کر گیا جب مہاراشٹروادی گومنتک پارٹی کے ایک ممبر جناب جے شٹیودکر نے ایک غیر سرکاری قرارداد ایوان میں بحث کے لئے پیش کی۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ حکومت گوا سرکاری کاموں کے لئے مراٹھی زبان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔ صاف الفاظ میں اس قرارداد کا مقصد یہ تھا کہ حکومت سرکاری خطوط کا جواب مراٹھی میں دے، مراٹھی میں سرکاری گزٹ چھاپے جائیں اور سرکاری مدد سے چلنے والے تمام اسکولوں میں مراٹھی کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ یونائیٹڈ گوان پارٹی نے اس قرارداد کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اپوزیشن لیڈر ڈاکٹر جیک ڈی سکویریا نے ایک ترمیم پیش کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ سرکاری زبانوں کی فہرست میں کونکنی اور اردو کو بھی شامل کیا جائے۔

(سیاست)

بہار ریاستی کانفرنس کی چند تجاویز

انجمن ترقی اردو بہار کی ساتویں ریاستی کانفرنس کی روداد ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں آ چکی ہے۔ اس کانفرنس کی کچھ اہم تجاویز دیر سے موصول ہوئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

ریاست کا لسانی جائزہ حکومت بہار کی سرپرستی میں راشٹر بھاشا پریشد بہار کی جانب سے ریاست کا لسانی جائزہ لیا جانے والا ہے اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کے صدر جناب لکشمی نرائن سدھانشو ہیں کانفرنس نے اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اس جائزہ میں اردو کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا اس لئے کانفرنس نے طے کیا ہے کہ انجمن کا ایک وفد ریاستی وزیر اعلیٰ سے مل کر صورت حال بتائے اور لسانی جائزہ کے لئے ازسرنو ایک ایسی کمیٹی بنانے کی ضرورت کا احساس دلائے جس میں ریاست کی کل زبانوں اور بولیوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندے شریک ہوں اور اس کا صدر کسی مستند ماہر لسانیات کو بنایا جائے بصورت دیگر انجمن کی جانب سے بھی ریاست کا لسانی جائزہ کا کام شروع کیا جائے

زبانوں کے سوال پر ازسرنو غور کرنے کا مطالبہ کانفرنس کی رائے ہے کہ آزادی کے بعد ارباب اقتدار نے زبان کے سوال پر جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے ملک میں انتشار پیدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے لہٰذا یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زبان کی موجودہ پالیسی کو کلیتہً رد کرتے ہوئے زبان کے سوال پر ازسرنو غور کرے۔

اردو اور حکومت بہار ریاست بہار میں اردو زبان کے سلسلے میں پچھلے عام انتخاب کے موقع پر یہاں کی بیشتر سیاسی پارٹیوں نے اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا وعدہ کیا گورنر کے خطبے میں بھی اس وعدہ کو دہرایا گیا لیکن بعد میں اس وقت کی ریاستی حکومت اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی اس لئے کانفرنس نے حکومت کے اس رویے پر اپنے گہرے رنج و افسوس کا اظہار کیا۔

اردو کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ اب تک اردو کے لئے صرف علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کی حیثیت کا مطالبہ کیا گیا لیکن اب اس جلسہ کا خیال ہے کہ اردو کو بھی وہی حقوق ملنے چاہئیں جو دستور میں درج شدہ دوسری زبانوں کو ملے ہیں لہٰذا یہ اجلاس یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اردو کو دوسری قومی زبانوں کے ساتھ ہی حکومت ہند کی سرکاری زبان قرار دیا جائے اور بہار، یوپی، دلی، اور مدھیہ پردیش میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جائے۔

حلقۂ ادب بہار کی نشست میں پرویز شاہدی کے فکر و فن پر اظہار خیال

پٹنہ، ۸ مئی کی شام کو انجمن اسلامیہ ہال میں حلقۂ ادب بہار (ریاستی انجمن ترقی اردو) کی ماہانہ نشست جناب ڈاکٹر اختر اورینوی (سرپرست حلقۂ ادب) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ صدر جلسہ کی تحریک پر طے کیا گیا کہ نشست کو جناب پرویز شاہدی مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن پر گفتگو کے لئے مخصوص کر دیا جائے چنانچہ کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے جناب پروفیسر عبدالمغنی، معتمد حلقۂ ادب نے مذکورہ ذیل تجویز تعزیت پیش کی جس کو حاضرین نے منظور کیا۔

"جناب پرویز شاہدی مرحوم اردو شاعری میں اپنے کمالات کے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ بالخصوص نظم نگاری میں وہ ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ شاعری میں ان کا اپنا ایک اسلوب اور آہنگ تھا۔ لہٰذا ان کی وفات سے اردو ادب کو بڑا نقصان پہونچا ہے اور اردو شاعری کے قدر شناسوں کے لئے یہ سانحہ المناک

حلقۂ ادب کی یہ نشست مرحوم کی وفات پر اپنے قلبی صدمے کا اظہار کرتی ہے۔ اور ارکان حلقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے اور پسماندگان کو صبر و شکیب عطا کرے؛

اس کے بعد اکرام حسین پرویز شاہدی مرحوم کی شخصیت اور فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر۔ جناب اسلم آزاد۔ جناب شکیب۔ جناب قمر اعظم ہاشمی۔ جناب ڈاکٹر عبدالوہاب اشرفی۔ پروفیسر عبدالمغنی۔ جناب رضا کریم رضا۔ جناب رضا نقوی واہی۔ پروفیسر سید حسین۔ جناب مولانا ماہتاب صدیقی۔ اور پروفیسر عطا الرحمٰن عطا کاکوی نے روشنی ڈالی۔

جناب اختر اورینوی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی پہلی ملاقات پرویز صاحب سے ۱۹۲۲ء میں اقبال ہوسٹل (پٹنہ کالج) میں ہوئی اور اس وقت پرویز صاحب کلکتے سے ایک رسالہ "جدید اردو" شائع کرتے تھے۔ پرویز شاہدی کی شہرت برصغیر ہند و پاک میں تھی اور اردو دنیا نے ایک بڑی حد تک ان کی قدر شناسی کی، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ان کی مزید قدردانی ہونی چاہیے تھی۔

اختر صاحب نے عبدالمغنی صاحب کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ مرحوم کی شاعری میں عظیم امکانات پوشیدہ تھے اور اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو یہ امکانات بروئے عمل آتے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے اختر صاحب نے کہا کہ پرویز کا دل ایک مسلمان کا دل تھا، وہ ایک مہذب اور باوضع انسان تھے ان کی ترقی پسندی صالح رخ پر تھی، خاص کر عمر کے آخری حصے میں وہ بہت متوازن ہو گئے تھے، وہ در اصل مساوات اور عدل و اخوت کے اسلامی قدروں کے علم بردار تھے۔ آخری عمر میں اشتراکیت کے طریقے ان کی نگاہ میں مشتبہ ہو گئے تھے اور وہ اسلامی خطوط پر سوچنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ پرویز اپنے اوپر کی گئی تنقیدوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

آخر میں صدر حلقۂ ادب پروفیسر عبدالمغنی نے اعلان کیا کہ ماہنامہ "مریخ" پرویز شاہدی نمبر شائع کرے گا جس کا اجرا حلقۂ ادب کے زیر اہتمام پورے بہار میں ایک تقریب منعقد کر کے کیا جائے گا۔ (ظفر ساجد)

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کا مشاعرہ

۴؍مئی کو ادبی ٹرسٹ کے سالانہ کل ہند مشاعرہ میں جو جناب ودیا شنکر سکریٹری حکومت ہند کی زیر صدارت حیدرآباد کے نمائش میدان میں منعقد ہوا۔ تقریباً ۱۵ ہزار اردو دوستوں نے جن میں ریاستی وزرا، حکام، تاجر، ڈاکٹر، وکلا، خواتین سیاسی قائدین اور ہر طبقے کے عمائد افراد شامل تھے، جس شائستگی اور نظم و ضبط کا ثبوت دیا اس سے اردو والوں کی تہذیب و ثقافت پر ایمان تازہ ہوا۔ اس مشاعرے کی رسم افتتاح میسور کے وزیر ٹرانسپورٹ جناب محمد علی نے انجام دی۔ اور مرکزی نائب وزیر قانون جناب یونس سلیم نے اس میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ان حضرات نے ادبی ٹرسٹ کی کارکردگی کو سراہا اور توقع ظاہر کی کہ حیدرآباد اردو کے نشاۃ ثانیہ کا مرکز بن جائے گا۔ میر مشاعرہ جناب ودیا شنکر صاحب نے اردو کے تعلق سے اپنی تقریر میں بڑی دور رس باتیں کہیں انھوں نے بڑے اثر انگیز الفاظ میں جنگ آزادی کے دوران اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی خدمات اور ان کی قربانیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ آزادی کے بعد اسی اردو کو اسی کے وطن میں جلا وطن کر دیا گیا ہے اور وہ کبھی بمبئی اور کبھی مدراس میں بے وطنوں کی طرح آوارہ و پریشان نظر آتی ہے تو کبھی حیدرآباد کو اپنا دوسرا وطن قرار دینے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں اردو والوں پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اردو کے وطن کی بازیابی کا مطالبہ کریں اس کے بعد مشاعرہ کا آغاز مینا قاضی کی غزل سے ہوا۔

اور اس کے بعد محترمہ جمیلہ بانو (دہلی)، جناب اختر سعید (بھوپال)، جناب مخدوم محی الدین، شاذ تمکنت (حیدرآباد) حضرت روش صدیقی (دہلی)، ابن احمد تاب (حیدرآباد)، سلیم کچھوچھوی (دہلی)، سلیمان خطیب (گلبرگہ میسور) خیرات ندیم (حیدرآباد) علی سردار جعفری (بمبئی)، کیفی اعظمی (بمبئی)، حضرت مہیکش اکبرآبادی (دہلی)، سکل اتساہی (بمبئی)، صلاح الدین نیر (حیدرآباد)، تاج مہجور کلا مرج بعقوبی (حیدرآباد) زبیر رضوی (دہلی)، سعید شہیدی (حیدرآباد) نے اپنی تازہ نظمیں اور غزلیں پیش کیں۔ (عابد علی خاں)

صفحہ ۱۲ سے آگے

کرنا ہے ادبی فارم کے ذریعے سے زندگی کے فارم اور اس کی معنویت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کوئی ادیب اچھا یا برا نہیں ہوتا، اس کے بعض کارنامے اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ ہماری نظر کارناموں پر ہونی چاہیے۔ ادیبوں پر لیبل نہیں لگانا چاہیے آج کل نظم یا افسانے کی خصوصیات پر کم گفتگو ہوتی ہے۔ شاعر یا افسانہ نگار کو ترقی پسند یا رجعت پسند ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ ہمعصر ادب میں اس انتہا پسندی سے بچنے کی ضرورت اور زیادہ ہے۔ کیونکہ ادیب یہاں آج ایک ذرہ ہوا کا کوئی دوسرا۔ ہر ادیب اور شاعر وقت گزرنے کے ساتھ بدلتا جاتا ہے وہ اپنے کو دہرانے لگے گا۔ ضرورت ہے کہ ہم کارناموں کو پرکھیں شخصیتوں پر سستے لیبل لگانے سے پرہیز کریں جس طرح چیزیں اچھی یا بری ہوتی ہیں وہ اچھے یا برے نہیں ہوتے ان پر حکم لگانے سے پہلے ہمیں سارے کا سارا پڑھنا پڑے گا۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

ہمارے ملک میں تناسب کا احساس بہت کم ہے۔ ہم ہر چیز میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ مدح میں بھی اور قدح میں بھی۔ ستائش میں بھی اور عیب جوئی میں بھی۔ کسی کی تعریف کریں گے تو اسے آسمان پر پہنچا دیں گے۔ کسی کی برائی کریں گے تو اسے تحت الثریٰ میں گرا دیں گے۔ ہمارے نزدیک صرف ہم سیدھے راستے پر ہیں باقی سب کج روی کے شکار ہیں۔ صرف ہماری نیت صاف ہے، دوسرے کی نیت میں ضرور کھوٹ ہے۔ ایک زمانے میں ملاؤں اور پنڈتوں کے متعلق ایک لطیفہ مشہور تھا۔ کسی نے ایک ملا سے پوچھا کہ قبلہ آپ کے نزدیک حق پر کون کون ہے۔ اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "ایک تو میں اور ایک میرا بھائی، مگر وہ بھی کیا" میر سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس دور میں شاعر کون کون ہے۔ انھوں نے فرمایا ایک تو درد، ایک یہ خاکسار، آدھے مرزا رفیع تھا۔ میر سوز کے متعلق دریافت کیا گیا تو کہا پونے تین سہی، مگر ایسے مخلص شریفوں میں ہم نہیں تھے۔ خیر کچھ عرصہ پہلے تک کٹر پن سیاست میں خاصا نمایاں تھا۔ ہر پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کو گمراہ اور بدنیت سمجھتے تھے۔ بعض کمیونسٹ اپنے مخالفوں کو امریکہ کا ایجنٹ کہنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے تھے۔ کمیونسٹوں کے مخالف انھیں دھڑلے سے روس کا ایجنٹ کہا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سیاست تک محدود رہتا تو بھی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ ہندوستان میں سیاسی شعور ابھی گہرا نہیں ہے، انتہا پسندی عام ہے۔ عوام کا ذہن ابھی بیدار نہیں ہوا، اس لئے سستے نعروں اور الزامی جملوں سے لوگ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ عام فضاؤں میں ووٹ سبھی سے لینا ہوتا ہے اور ان کو متاثر کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اعداد و شمار، حقایق، عملی نتائج کو نہیں دیکھتے، جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لئے ہر حربہ جائز سمجھا جاتا ہے۔ کامیابی سب سے بڑی چیز ہے۔ ذرائع کی کون پروا کرتا ہے۔ مگر یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے کہ اب ادب میں بھی یہ انتہا پسندی آ رہی ہے۔ جو لوگ قدیم رنگ کے دلدادہ ہیں اور روایت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ اگر ہر نئی چیز کو لغو اور بے معنی اور ہر تجربے کو تخریب قرار دے دیں تو یہ قدرے سمجھے جا سکتے ہیں کہ پرانے دقتوں کے رنگ میں انھیں کچھ نہ کہو۔ مگر تعجب تو ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنے کو جدید دور کا آدمی کہتے ہیں جن کا علم وسیع اور ذہن بیدار کہا جا سکتا ہے مگر جو اپنے کو انتہا پسندی سے نہیں بچا سکتے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی ترقی پسندی پر فخر کرتے ہیں، مگر ترقی کے معنی صرف اشتراکیت کے پرچار کے لیتے ہیں۔ یہ جمہوریت کا نام لیتے ہیں مگر جمہوریت میں ہر فرد کو جس طرح اپنے خیال کے اظہار کی اجازت ہوتی ہے اس پر پابندی عائد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے مخالفوں کو جھٹ امریکہ کا ایجنٹ، بلکہ سی آئی اے کا ایجنٹ کہہ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی ترقی پسندی کے باوجود زبان کا ایک جامد تصور رکھتے ہیں۔ عوام کے یہ علمبردار غلط العوام تو درکنار، غلط العام کو بھی نہیں مانتے، چلن کا نام لیتے ہیں مگر زبان کے چلن کو ٹھکراتے ہیں۔ اردو کو ایک خود مختار زبان کہتے ہیں مگر اسے عربی یا فارسی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں۔ جدیدیت کے میلان میں اچھے اور برے سبھی پہلو ہیں۔ کس میلان میں نہیں ہوتے۔ یہ صرف برے پہلوؤں کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ کلاسیکی شاعری میں غم کی بہتات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر آجکل کے شاعر کے غم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ پرانی شاعری میں جنس کے چٹخارے کو بھول جاتے ہیں اور آج کے بعض شعرا کے یہاں جنس زدگی کی وجہ سے پوری جدید شاعری کو جنس زدہ کہتے ہیں۔ پرانی رعایت لفظی اور لفظوں کے طوطا مینا انھیں گوارا ہیں۔ مگر لفظ سے نیا کام لینا، اس کا تہ دار اور پہلو دار استعمال انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یہ انتہا پسندی نئے لوگوں میں ہوتی تو تعجب کی بات نہ تھی۔ نئی نسل تو شباب کے جوش میں اپنے کو خلاصۂ کائنات سمجھتی ہی ہے اور اس کا انا کو تسکین دینے کے لئے اپنے پیش روؤں کی اہمیت سے انکار کر دینا سمجھ میں آتا ہے۔ برہم نوجوانوں (ANGRY YOUNG MEN) کی برہمی پر کوئی سمجھدار آدمی چونکتا نہیں۔ اس پر غور کرتا ہے کہ یہ برہمی کیوں ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے۔ لیکن آجکل ہمارے ادب میں کچھ برہم بوڑھے بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ برہمی زیب نہیں دیتی کیونکہ بڑھاپے کا شعور علم کی سنجیدہ گفتاری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس برہمی سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ کہیں ادب کی دنیا میں ہر قسم کی اجارہ داری کے ٹوٹ جانے پر تو یہ برہمی نہیں ہے۔ ادب کو خاص سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی جو روش کچھ عرصے پہلے مقبول تھی۔ اس کے خلاف ردعمل پر تو یہ ناراضگی نہیں ہے؟ زندگی کی طرح ادب میں بھی صرف سفید اور صرف سیاہ نہیں ہوتے۔ نہ ادب میں دو کھرے مخالف میلان ہوتے ہیں۔ اگر ادب ادب ہے، محض ہسٹریا یا پروپیگنڈہ نہیں ہے تو اس میں صرف خیالات کی اہمیت نہیں ہوتی، خیالات کے ادبی اور جمالیاتی اظہار کی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا کلام ہر شخص کی سمجھ میں آئے نہیں، وجد میں لاتا ہے، کیفیت پیدا کرتا ہے، ذہن میں نغمہ پیدا

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲)

مالک انجمن ترقی اردو سید علی گڑھ و پرنٹر قمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپایا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا